(آنلاین ایڈیشن)

سازِ سلاسل

(پہلا حصہ)

مظفر عازم

... 2005 ...

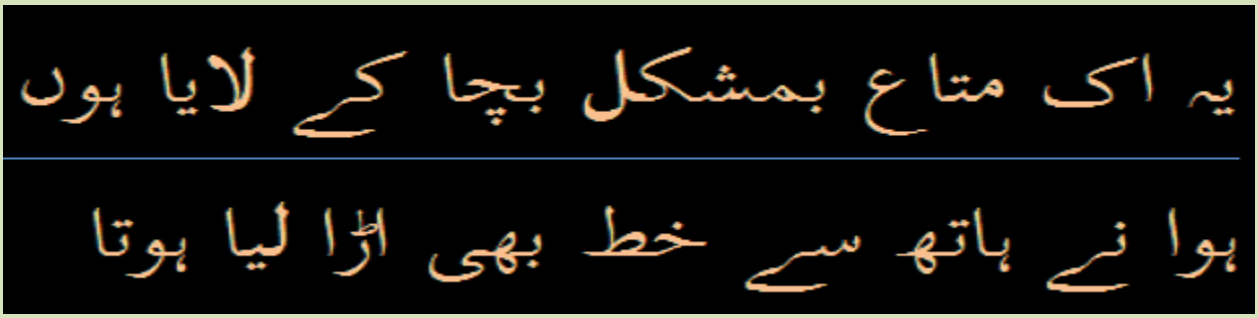

دعا

سمندر!
یہ بادل کے نادار ٹکڑے
جنہیں اپنی سبکی اور بے
مایگی
اوج موج ہوا پر چڑھاکر
بلندی کے موہوم جھانسے
میں لاکر
پراگندہ و منتشر کر رہی ہے

سمندر!
اس اپنے طلب گار کے لب
کبھی ان کی خیرت سے تر نہ کرنا

*

مرکب

ہانپتے لمحات
ہانک

ہر
رگِ جاں
سُم ہوئی

سانس
صحرا
گردباد

ہنہناہٹ
گُم ہوئی

*

اذان

ہوا!
ترا فرضِ منصبی ہے
کہ شاخساروں سے
پیلے پتوں کا بوجھ اتارے

مگر
یہ اجڑے چمن
یہ اکھڑے شجر
تو ساکت شہادتیں
اک شہامتِ ناتراش کی ہیں

نہ بھول
تیرا حساب ہوگا!

اور، ہاں
ترازو کے ایک پلڑے میں
ایک شاعر کا خواب ہوگا

*

*

کہتے ہیں کہیں اک بستی تھی، وہاں چاند ستاروں کے گھر تھے
نیلی جھیلوں میں امرت تھا اور امرت میں نیلوفر تھے
سب سروِ روان سر دھنتے تھے ہر موج ہوا کی شوخی پر
سنبل کہ زلیخا کی زلفیں شمشاد کہ یوسف پیکر تھے
پھر رُت بدلی، اس بستی کے کھیتوں میں کانٹے اگ آئے
تب سحر زدہ بستی والے سب ان کانٹوں پہ نچھاور تھے
پھر داؤ پہ تھے کیا کاسۂ سر کیا مال و متاعِ قلب و جگر
کچھ ان کانٹوں کے مالی تھے کچھ ان کانٹوں کی زد پر تھے
پھر ہر پگڑی پر پاؤں تھا ہر منہ کا مقدر تالا تھا
پھر ہر حلقوم پہ جونکیں تھیں اور ٹوٹے بکھرے شہپر تھے
ان ٹیڑھی سیدھی راہوں پر بے راہ ہجوم آوارہ تھا
جو روپ سے رہبر صورت تھے، سرگشتوں کے سوداگر تھے
بازو سر سے صف آرا تھے، جان اور جگر میں ان بن تھی
سب باسی بونے سائے تھے اور سایوں کی گردن پر تھے
اس جھیل میں جو بھی مچھلی تھی وہ کانٹا کانٹا کہتی تھی
اس شاخ پہ جو بھی طائر تھے وہ راحتِ دام کے خوگر تھے
جو داد طلب وہ زنجیری جو عالم سو ہُو کا عالم
اک مقتل محشر ساماں تھا اک گم صم داورِ محشر تھے
ہر روپ میں غم فریادی تھا ارباب وفا کی محفل میں
کیا عازمؔ تھے کیا آہیں تھیں کیا نالے تھے کیا نشتر تھے

***

*

آشفتگی کو ترکِ تمنّا کے موڑ پر — شرقِ جمال برق ادا روبرو ہوئی
شبنم لبِ شگوفۂ پژمردہ پر پڑی — خوشبو ہوا سوار ہوئی چار سو ہوئی
سورج افق کی آگ کی آغوش جلا — بھولی شفق بھی بھاگ بھری سرخرو ہوئی
وہ لمحۂ فراغ چمن باغ باغ تھا — رُت کی پھوار پھول کو وجہِ نمو ہوئی
اک عہدِ نامراد کے یاس و ہراس میں — اک تازہ کار طبعِ رواں شکر خو ہوئی
سب کچھ تہس نہس تھا، بہ یک حرف دل کشا — بیدار خفتہ آرزوئے آرزو ہوئی

*

ہریالی اور نیل گگن — ناچ مرے متوالے من
نیل آکاش میں کویلیا — لہری، من موجی، برہن
پھولوں کو چھب دکھلاتی — تتلی پھلواری میں مگن
اپنی خبر پائے نہ سگندھ — ایسے نچائے اس کو پون
تپتی تڑپتی دھوپ آئی — اوس نثار کرے جیون
کاجل کاجل شام کی آنکھ — سورج وارے کرن کرن
راج تِلک سے بھاگے آج — رام کا جی برمائے بن
پیار کی اگنی روپ بھسم — پیتم کو تاکے سوکن
مجھ بھولے سے بولا کون — ایک پہیلی لاکھ الجھن
یہ غم سے آزاد غزل — امریکہ کے نام ارپن
عازمؔ روپ اپنا پہچان — یہ دِن، یہ دُھن یہ دھڑکن

*

[غیر معروف بحر میں ایک تجربہ]

جنگل رحمتِ باراں کو ترستے ہیں ہمارے
بادل بحر کی گہرائیوں کو ہوگئے پیارے

اب کے آگ برستی ہے ہوا کوہ و دمن پر
اب کے تشنگیٔ سرو و سمن کس کو پکارے

یاں اس جوئے خراماں کو خزاں چاٹ رہی ہے
واں اس شاخِ صنوبر پہ ستم گار ہیں آرے

کس کے در پئے آزار شیاطین کی شہ پر
کس کی رفعتِ افلاک سے ٹوٹے ہیں ستارے

اب کیا خارِ بیاباں بھی کرے کارِ نمایاں
سوکھے آبلۂ پائے جہاں گرد کے دھارے

پوچھوں تجھ سے اے امکانِ کرامات کہیں پر
کوئی زندہ ہے تعذیب تمنّا کے سہارے

*

خود اپنا جرم خود اپنی سزا تھی
وہ رات افسردگی کی انتہا تھی

سرِ شام آرزو ہی سوگئی تھی
نہ دل بے کل نہ ہونٹوں پر دعا تھی

ہوا بھی خشک لب ہی رینگتی تھی
کلی بھی بے دلی میں مبتلا تھی

ستانے کا سلیقہ سو گیا تھا
بخود بیزار غصّے کی ادا تھی

دل رسوا کی برسوں کی کمائی
برنگِ آرزو زنجیرِ پا تھی

دریچے بند تھے اک بھوت گھر کے
کھلے آنگن میں پر بستہ ہوا تھی

کنویں کی کوکھ میں پتھر پہ لیٹی
صدا گونگی تھی لب نا آشنا تھی

نہ منزل کی تمنا کارواں کو
نہ ہمدم کوئی آوازِ درا تھی

نہ شاہینِ طلب پرواز خو تھا
نہ کوہ و دشت میں پاگل ہوا تھی

نہ کشتی تھی نہ موجیں کھیلتی تھیں
وہ سوکھی جھیل سب ساحل نما تھی

کسی کوچے میں عازمؔ بجھ گیا تھا
غزل اس خامہ فرسا سے خفا تھی

*

اپنی تلخیٔ مے سے ساغر ٹوٹ گیا
پینے والا آنسو پی کر ٹوٹ گیا

بت کو پجاری بیچ کے کھانے آنکلا
شرمِ گنہ سے تیشۂ آزر ٹوٹ گیا

جادو اب بھی ایک جہاں پر غالب تھا
خود محرومِ یقیں جادوگر ٹوٹ گیا

خواب کے شہر میں سایۂ ابرِ بہاراں تھا
آنکھ کھلی تو سارا منظر ٹوٹ گیا

ٹوٹ گیا پل بھر ہی میں سیلاب کا زور
اک پُل، اک دیوار گرا کر ٹوٹ گیا

بوجھ اپنی شاخوں کا بھی کم بوجھ نہ تھا
کیسا تھا وہ پیڑ تناور، ٹوٹ گیا

پھر وادی سے گولی کی آواز آئی
پھر میرے شاہین کا شہپر ٹوٹ گیا

عازمؔ آج غزل کیوں سہمی سہمی ہے
سوچ صدف میں موتی کیوں کر ٹوٹ گیا

*

[غیر معروف بحر میں ایک تجربہ]

پیلا پیرہنِ شاخ سرِ خاک پڑا ہے
اور اب عہدِ دل آزاریِ یخ بستہ ہوا ہے

موجِ آبِ رواں خاکِ ستم گر نے نگل لی
دریا اپنے کناروں سے اماں مانگ رہا ہے

کس نے حبس کے ماروں کی مناجات سنی ہے
کس کے کھیل سے اے موجِ ہوا دیپ بجھا ہے

سورج ان کے مساکن کا پتا بھول گیا ہے
میرے شہر منور میں جو مخلوقِ خدا ہے

پہرا نہر پہ ہے، ریت لہو چوس رہی ہے
آزاد اشکِ شرر بار، گرفتار صدا ہے

ذکرِ پیرِ مغاں نے نہ سراپائے نگارے
عازمؔ بیت غزل کلبۂ احزانِ صدا ہے

*

کلی کی پیاس کا شکوہ جگر کو چیر گیا
نہ تھا جو ابر تو شبنم نے کچھ کیا ہوتا

یہ اک متاع بمشکل بچا کے لایا ہوں
ہوا نے ہاتھ سے خط بھی اڑا لیا ہوتا

کریدتا نہ قلم زخمِ دل اگر عازمؔ
کلام زرد زباں کا کہاں ہرا ہوتا

*

سفر کے ستم بھی دل آزار تھے
مسافر بھی کچھ سست رفتار تھے

یہ منزل پرستوں سے مخفی رہا
خمِ رہگزر گیسوئے یار تھے

شکستِ خودی کے بجھائے ہوئے
دل ان کے تمنا سے بیزار تھے

ہواؤں کے پاؤں میں زنجیر تھی
صدا کے سلیقے گرفتار تھے

فرات ان کے گاؤں کے دامن میں تھا
کنارے مگر آبِ تلوار تھے

وہ ہشیار جو سر کٹا کر گئے
جمالِ نظر کے خریدار تھے

تری یاد کی آنچ آتی رہی
شبِ غم کے لمحات گلنار تھے

غزل! اب ترے دم سے ہیں لب کشا
وہ عازمؔ کہ بس عجزِ اظہار تھے

*

کیا ملا تجھے موسم ہم کر مبتلا کر کے
درد کی متانت کو حرف آشنا کرکے

دیکھ اے مرے سورج میں ترا ثنا خواں ہوں
نور سے نمو لے کر، نار کو نوا کرکے

آہ کو سکھائی ہے چاہ کی ہوا خواہی
آنکھ کو سِدھایا ہے مہ لقا کرکے

جان سی عطا تیری جان کرلٹا دی ہے
خس مثال پتلے کو برق آزما کرکے

آپ کی توجہ کی ابتدا عنایت تھی
ہم نے انتہا کردی ایک التجا کرکے

در پہ کرگیا رسوا نام پوچھ کر واعظ
ہم خدا کے گھر آئے تھے خدا خدا کرکے

عشق کی عطا عازمؔ عاقبت فراموشی
درد نے کیا رسوا داستاں سرا کرکے

*

پیلے پتے نے دوشِ طوفاں پر
مجھ کو میرا پتا بتایا ہے

جوئے کم آب کو بدھائی دو
بحرِ ذخار نے بُلایا ہے

دوش پر تھا جو تھا سو ہوش نہیں
بوجھ ڈھونے میں لطف پایا ہے

دستِ کوتاہ و شاخ شاخ گلاب
میرے سینوں پہ سانپ سایہ ہے

پائے مجروح و سایۂ دیوار
کچھ ہمارا ہے، کچھ پرایا ہے

خستگی سے خفا نہیں ہے بدن
سر کی سوغات کا ستایا ہے

*

کایا اور چھایا دونوں ہم قامت ہوں
ایسا بھی دن رات میں دم بھر ہوتا ہے

خواب خیالوں کو پیراہن دیتے ہیں
جاگنے والے بول یہ کیوں کر ہوتا ہے

لہروں کا یہ رقص ہوا کے ہاتھ میں ہے
یا یہ بحر کی تہ کی شہ پر ہوتا ہے

کھوج کی خواہش کس موسم میں سوتی ہے
بوجھ کسے خود اپنا شہپر ہوتا ہے

عازمؔ تیرے شہر کی شہ راہوں پر کیا
اب بھی سایۂ شاخِ صنوبر ہوتا ہے

*

[غیر معروف بحر میں ایک تجربہ]

سُن اے چرخِ فلک غلغلۂ آہ و فغاں ہے
تارِ زلفِ شبِ تار رگِ بربطِ جاں ہے

چاہت پر نہ چلیں گردشِ افلاک کی چالیں
تیرِ فکر بھی پرّاں ہے اگر پشت کماں ہے

میرے شہر کے ہر کوچۂ خوں رنگ میں تحریر
دستاویزِ دلِ بے بصرِ چارہ گراں ہے

سورج ہی کی عنایت علَمِ جرآتِ پیکار
موسم فرطِ تمازت سے اگر شعلہ بجاں ہے

سُن، میں واقفِ اسرارِ تگ و تاز کہاں ہوں
میری آنکھ تو مسحورِ خمِ موجِ تپاں ہے

کیسا میکدے میں مکتبِ تفسیر کھلا ہے
مے کیا شے ہے وہاں نشۂ مایوسیٔ جاں ہے

رسم و راہِ زمانہ بھی، اور آدابِ سخن بھی
رقصِ شررِ جاں کی بھی تو اک اپنی زباں ہے

*

پھڑکتا پرندہ فضاؤں میں ہے
بڑھاپا لڑکپن کے گاؤں میں ہے

کھلی دھوپ میں برملا کھیل کر
بدن بید زاروں کی چھاؤں میں ہے

غٹرگوں غٹرگوں زباں آگئی
تکلف تھرکتی صداؤں میں ہے

کلائی کو پوروں نے مس کرلیا
دھڑکتا کھلونا بلاؤں میں ہے

تڑپ کو تکلف سے پالا پڑا
تمنا کی تتلی ''میں آؤں'' میں ہے

نگاہیں دریچے میں اٹکی ہوئیں
خیالوں کا مرکب خلاؤں میں ہے

زمیں اس گلی کی ہے آہن رُبا
کہ جادو کی زنجیر پاؤں میں ہے

میں کیا پوچھ لوں، آپ کیا بوجھ لیں
پہیلی تو خلوت سراؤں میں ہے

ذرا طفل خو عازمَ پیر ہے
کہ ظالم ستم آزماؤں میں ہے

*

جب اپنے چاہنے والے کو آنکھ بھر دیکھے
قدِ بلند کو اپنے بلند تر دیکھے

صبا تو نیند اڑا کر چلی گئی ہوگی
گلاب شاخِ ستم پر ہی دوپہر دیکھے

غرورِ دشت نوردی کی داستانِ دراز
لہو میں فرس تمنا کو تا کمر دیکھے

بس اپنے آبلۂ پا کی آبرو رکھ لے
جنونِ شوق نہ منزل نہ رہگزر دیکھے

متاعِ اصل کو گنجینۂ جگر میں چھپا
کہ چشمِ خلق تو بس عکس کا ہنر دیکھے

زمانہ زہرِ زباں سے نڈھال خود کو کرے
ہماری آنکھ میں درمان در گزر دیکھے

سخن شناس ہو، اس کے سکوت کو پڑھ لو
جو غم نصیب صدا کو شکستہ پر دیکھے

وہ پیڑ اپنی خزاں کو سلام کرتا ہے
جو برگِ زرد کی آغوش میں ثمر دیکھے

ابھی تو پیر فلک کے قدم سلامت ہیں
عجب نہیں یہ شبِ تار بھی سحر دیکھے

پگھلتی برف کے دن ہیں، خدا کرے عازمَ
شگفتِ گل میں تری آہ بھی اثر دیکھے

*

کوئی خیال کرے پل کی پاسبانی کا
کہ آگ ہونے لگا ہے مزاج پانی کا

لہو سے لکھتے رہے اس کو ہم نفس میرے
بنی نہ بات کہ ہیرو نہ تھا کہانی کا

میں آپ اپنی بلاؤں کا میزباں بن کر
رفیقِ کار رہا رنگِ آسمانی کا

خود اپنے سوزنِ مژگاں سے میرے لب سی کر
بھلا ہے اس کا گلہ میری کم زبانی کا

بہ خندہ برق تجلّی، بہ گریہ شبنمِ جاں
شگوفہ شاخِ ستم پر ہے مہربانی کا

بہار خو ہے خزاں میں چنار سایہ مرا
سکوں نواز سہارا ہے زندگانی کا

فصیل ٹوٹی تو عازمَ برہنہ پا بھاگا
کوئی پتا نہ ملا تب سے یارِ جانی کا

*

[غیر معروف بحر میں ایک تجربہ]

شب وہ شہرِ خرابات میں کیا ہم نے گزاری
لو اک شمعِ فروزاں کی دل و جاں میں اتاری

نے تھی نارِ نواہاے پُر اسرار سے لبریز
لے تھی روئے گلِ تر کے لیے بادِ بہاری

دیکھیں اپنی نگاہوں نے بھی کچھ اپنی ادائیں
رخ تک آئینہ کے آ نہ گئی آہ ہماری

یاں تھی ریگِ رواں جلوہ گہِ انجمِ تاباں
واں تھی موجِ تپاں ماہِ درخشاں کی سواری

خاکستر میں رہے تخمِ گُل و لالہ پُر امّید
پتھر سے بھی وہاں جوئے جگر تاب تھی جاری

برگِ سوسنِ گلمرگ سخن ور کی زباں تھی
اک کیفیّتِ کشمیر تھی کونین پہ طاری

لب اک لعبتِ شب تاب کے فردوسِ نوا تھے
عازمؔ! کارِ جنوں بارِ متانت سے ہے عاری

*

آتشِ جاں میں جل رہا ہے چنار
اپنے موسم بدل رہا ہے چنار

چشمِ نرگس کی آبیاری سے
وادیٔ گل میں پل رہا ہے چنار

غرقِ دریا غرور طوفاں کا
آفتوں میں اٹل رہا ہے چنار

کیسا جھکڑ ہے، جان لیوا ہے
گرتے گرتے سنبھل رہا ہے چنار

پیلے پت جھڑ کا منہ چڑانے کو
سرخ رو بر محل رہا ہے چنار

قافیہ تنگ ہے غزل خواں کا
اس کے اشکوں میں ڈھل رہا ہے چنار

*

بحر ہی میں نہ ڈوبنا بارش
آنکھ صحرا سے بھی ملا بارش

ریت سے رم ترا تماشا ہے
آبشاروں کی آشنا بارش

پیاس بھی تھی تو پاس بھی تھا ترا
سب کا شیوہ گِلہ نہ تھا بارش

تیری پونجی ہے تو سنبھال اسے
میری پلکوں پہ مبتلا بارش

میں تجھے جل ترنگ کردوں گا
میرے حجرے میں دندنا بارش

پوچھتی ہے کلی کلی کا مزاج
سیکھ شبنم سے یہ ادا بارش

تھم ذرا تھم ترے برسنے سے
نم ہوئی درد کی قبا بارش

تر پلک تر زبان تر دامن
بارے عازمؔ ہے بر ملا بارش

*

یہ روز و شب کہ رسوم و قیود سے نہ چھٹے
وہ چاندنی سے گریزاں، یہ دھوپ سے بیزار

وہ دیپ آج بھی پاگل ہوا سے لڑتا ہے
ہو جس کی جوت پہ سورج کی روشنی بھی نثار

نظر نے تیرے ترحّم کے تیر تاڑ لیے
ہوئے نگاہِ کرم سے ہم اور سینہ فگار

نظر کے کھیل کا میداں ہے ماورائے نظر
شبابِ حسنِ بیاں کا حجاب ہے گفتار

جنوں جناب کا بھی کب اچھل پڑا عازمؔ
کہ جب متاعِ سلاسل کا اٹھ گیا بازار

*

کم شبِ مہ کا التہاب نہیں
خواب محرومِ آفتاب نہیں

آنکھ کی آڑ میں امڈتا ہے
درد بے کل ہے بے حجاب نہیں

خار و خس بھی ہیں خانہ زادِ چمن
خونِ موسم فقط گلاب نہیں

پیاسے پنچھی کو کیا پلائیں گے
ان کی تلوار میں وہ آب نہیں

لوریاں دے رہے ہو مجنوں کو
جیسے روزن میں ماہتاب نہیں

میکدے میں حرام ہے پرہیز
بخت بد ہے اگر خراب نہیں

ہم گنہگار کس حساب میں ہیں
ہم سے کیا کیا ہوا حساب نہیں

ہم گداگر ہیں، پر نہیں اس کے
اسم جس کا کلید باب نہیں

عام الطاف کا یہ عالم ہے
آج عازمؔ پہ بھی عتاب نہیں

*

تڑپ کا تیر تمنا کا تازیانہ صبا
تلاش بو میں بسوئے چمن روانہ صبا

کبھی نہ دیکھ سکی دوپہر کو آتشِ گل
مزاج میں ہے کہاں ہم سی عاشقانہ صبا

نشیب باغ خس و خار میں الجھ جاتی
نصیب سے جو نہ ہوتی قلندرانہ صبا

کچھ اپنے طور طیورِ چمن کی داد تو دے
جو ہم سے رکھتی ہے چشمک معاصرانہ صبا

صلیب: سروِ خرامان، گلے کی پھانس: فغان
چمن تمہارا ہمارا غریب خانہ صبا

کبھی جگائیں تمہیں ہم، کبھی جگاؤ ہمیں
سحر کا کھیل رہے ربط کا بہانہ صبا

چمن میں دھوپ ہے، تتلی ہے، اور عازمؔ ہے
یہیں کہیں پہ بنا تو بھی آشیانہ صبا

*

ذرا سا تو منظر بدل کر لکھوں
تلاطم کے دل میں سمندر لکھوں

میں طرزِ تبسّم سے چکرا گیا
کچھ اس کو طمانچے سے بہتر لکھوں

وہ مسجد جو بھائی کی بستی میں ہے
اسے ضعفِ ایمان کا گھر لکھوں

ستاروں کو قسمت کا کاتب کہوں دلِ
قلم کو لکیروں کا تاجر لکھوں

داورِ شہر سے داد لوں
لٹے شہر کا حال خوش‌تر لکھوں

برس کر کروں ذکر برسات کا
اور سورج کا عمدہ گھٹا کر لکھوں

کہیں گاڑ دوں پیاس کو ریت میں
اور صحرا کے سینے پہ ساگر لکھوں

ہنسی میں کروں کوہ افکار سر
ہمالہ کی چوٹی کو چاکر لکھوں

بگڑ کر کروں بند اس باب کو
تکلم کے چہرے پہ چادر لکھوں

مسافر کو منزل رسیدہ کہوں
اور عازمؔ کو طنزاً مظفّر لکھوں

*

سمٹتے وقت کے خط کا جواب لکھتے ہیں
خزاں کی زرد ہوا پر گلاب لکھتے ہیں

منارہے ہیں تصوّر میں عید عہد شباب
جھکی کمر کو ہلالِ شباب لکھتے ہیں

لکھے گی کل کی حقیقت ان ہی کی تعبیریں
لہو قلم سے جو لوگ آج خواب لکھتے ہیں

شبِ حیات تمہارے اداس ماتھے پر
لہو سے شوخ قلم آفتاب لکھتے ہیں

سنا ہے زحمت پرواز کے پسینے کو
بیاض خلد بریں میں گلاب لکھتے ہیں

پرانا نسخہ ہے، لیکن ابھی برقصِ شرر
جبین آئینہ پر آفتاب لکھتے ہیں

بساطِ عالم امکاں الف سے یے تک ہے
چلو کہ یے سے ادھر کی کتاب لکھتے ہیں

*

ہے مزاج داں سنبل موسمِ گلِ تر کا
رخ ہوا کا تاڑ لیا، اور دوپٹا سر کا

دھوپ کی تمازت میں کونپلیں چمکتی ہیں
درد کا سنگھاسن ہے دید کے سکندر کا

اشکِ نرگسِ شہلا آئینہ ہے سورج کو
چاند کے تبسّم میں حال ہے سمندر کا

عکس کا شکاری ہوں آئینے بناتا ہوں
فطرتِ خلیلی میں سلسلہ ہے آزر کا

اک فغانِ بے ہنگم اشتہار سودا ہے
اک سکوتِ مہر بلب اسم ہے کسی در کا

زہد کے مباحث میں خلد کے صحیفے ہیں
عشق کی تگاپو میں ہر ورق ہے محشر کا

لفظ جو لکھا عازمؔ حسّو کا لبادہ ہے
اور عطائے حسن بیان، معجزہ مقدّر کا

*

نوا میں آگ رہی، کاج میں گلاب رہا
وہ نَے نواز بڑے ناز سے خراب رہا

کرن کرن کی رگوں میں ہے مہرِ ماہِ تمام
طوافِ عرصۂ گردوں میں آفتاب رہا

اتھل پتھل میں ہے دریا زکوٰۃِ بارش سے
سلیقہ مند سمندر کا اضطراب رہا

برہنہ حرفِ صداقت امینِ آبِ حیات
ہماری گھات میں ہر گام پر سراب رہا

رہا نہ حدِ نظر تک غبارِ رہ بھی کہیں
وہ قافلہ تو ہواؤں کا ہم رکاب رہا

بیانِ تیغِ طلب کا نیام افسانہ
بہشت کا بھی بیاضِ طلب میں باب رہا

سکوت میں جو سنایا زبانِ سوسن نے
وہ باب ہم نے لکھا، حاصلِ کتاب رہا

میں متفق ہوں وہ عازمؔ تو مختلف ہوگا
جو نیند تج کے طلبگار خلدِ خواب رہا

*

شرر پاک مری خاک میں جو شامل ہے
رقصِ انبوہ نہیں، رقصِ دلِ بسمل ہے

موسمِ زرد بنا دردِ طلب کا درماں
سبزہ گویا اثرِ زہر تھا جو زائل ہے

کاٹ کے نیل کوئی کود پڑا ہے کب کا
قافلہ خوف زدہ خفتہ لبِ ساحل ہے

ابر کم مایہ تھا، پلکوں کو بھی نم کر نہ سکا
صبر اے موسمِ غم، برق ابھی حاصل ہے

مضطرب فطرتِ ہنگامہ طلب ہے عازمؔ
دلِ ناسودہ کسی ناز پہ پھر مائل ہے

*

ہے یہ آتشِ تر کہ نظر جاناں
مرے ساغرِ جاں میں اتر جاناں

تری پہنائی کا پرندہ ہوں
ذرا تھام تو لے مرے پر جاناں

ہے دفاع کہ حملہ ہے رم تیرا
مرا دم ہے شکستہ سپر جاناں

جسے آگ نے آفت کو بخشا
مری بستی ہے وہ نگر جاناں

یہی ویرانہ مرا کاشانہ
مرے دوش پہ ہے میرا گھر جاناں

مری قید ہے ہم سرِ آزادی
نہیں، اس سے کہیں بڑھ کر جاناں

مری نیند آئینۂ خلوت ہے
مری شام ہے رشکِ سحر جاناں

مرا بھولاپن مری ہشیاری
مری ہشیاری مرا ڈر، جاناں

مرا حال بھی عازمَ کا سا ہے
مری ہار ہیں میرے ہنر جاناں

*

نَے ہوا خواہ ہے تو کیوں نہ نوا ہوجاؤں
اور بے منّتِ الفاظ ادا ہوجاؤں

لہر ساحل سے لڑے، شوخ کو شاباش کہوں
بحر سوجائے تو مجرم کی سزا ہوجاؤں

آبِ جو میں عکس کا رقص نچاتا ہے مجھے
میں پرِ کاہ سرِ موج ہوا ہوجاؤں

کس کو سوچا ہے کہ مٹی کا بدن آگ ہوا
اس کو تحریر کروں تو کیا سے کیا ہوجاؤں

دھوپ کی آنچ سے مجبورِ سفر ہوں عازمَ
چھاؤں مل جائے تو زنجیر بپا ہو جاؤں

*

خوشا نصیب کہ آئی، اور وقت پر آئی
بہار اگرچہ بڑی برف کاٹ کر آئی

نظر کرن، کہ دل و جاں غریقِ نور ہوئے
کرن شرر، کہ خس و خار میں اتر آئی

گلوں کی آگ پہ بارش ہے آتشِ تر کی
نظر نے ہونٹ جلائے تو آنکھ بھر آئی

جو گل کی آگ پہ ٹھہرے ترا وہ رنگ کہاں
صبا! صبا! تو چلی جا، کہ دوپہر آئی

فصولِ خواب کا خرمن ہے زر نگار خزاں
کدھر جگایا تھا جوبن جو یہ ادھر آئی

فلک نورد نظر مجھ سے بار بار ملی
یہ جتنی دور گئی اتنی اپنے گھر آئی

تمام رات گھلی شمع گھپ خموشی میں
دھواں اڑا تو کہیں قدرداں سحر آئی

فریبِ فکر ہے عازمؔ مگر دلاسا ہے
زباں بڑھاپے میں شاید شباب پر آئی

*

بے سُدھ چوٹی چوٹی سے ٹکرائیں گے
تم تک ٹوٹے پر لے کر کیا آئیں گے

بوڑھے پیڑ کی ٹہنی ٹہنی پیاسی ہے
روٹھے بادل بارش کب برسائیں گے

بارش بھی کیا شور طبیعت رحمت ہے
پیاس بجائے گی تو گھر بہہ جائیں گے

دیوانے دھن میں کانٹوں پر چلتے ہیں
ریت لہو پی لے گی، پھول اُگ آئیں گے

ساحل آپہنچا ہے، سمندر ساکن ہے
اب تو بیڑا پار ہے، اب کھو جائیں گے

عازمؔ کو تو بس اتنی ہی سدھ بدھ ہے
جامِ سخن چھلکائیں تو جی پائیں گے

*

رقص کرتے ہوئے، گرتے ہوئے پتے دیکھو
شجرِ پیر خزاں خواب جواں ہوتے ہیں

آگ اگلتے ہیں جو دب جاتے ہیں مٹی کے پہاڑ
ہم بھی کیا زندہ ہیں، بس اشک فشاں ہوتے ہیں

اونگھتے چوک میں استادہ سراسیمہ شجر
شہروں میں گاؤں کے پژمردہ نشاں ہوتے ہیں

بھولی بسری ہوئی بوسیدہ کتابوں کے ورق
چیختی روحوں کے اسرار نہاں ہوتے ہیں

پھول کی آگ ہو، شبنم ہو، کہ عازمؔ کی غزل
باغ میں آج بھی رحمت کے نشاں ہوتے ہیں

*

بیتے ساون کی گود میں بیٹھا
ایک بوڑھا ہے ، ہاتھ ملتا ہے

رات ہر دن کے بعد آتی ہے
چاند ہر شب کہاں نکلتا ہے

شعر عازمؔ کے بس کی بات نہیں
تیغ الفاظ کو غزلتا ہے

*

بدلیوں کے آنچل جب چاندنی سے پھٹتے ہیں
وہ شرارتی لمحے کشتیاں الٹتے ہیں

خلوتوں کی خوشبو کو کس طرح سہاریں گے
رم کا آسرا لے کر ہم سے جو نمٹتے ہیں

مقتلِ محبت کی ہر ادا کرامت ہے
سر بلند ہوتے ہیں سر یہاں جو کٹتے ہیں

دن ڈھلے تو دھرتی پر دندناتے آئیں گے
دوپہر کو جو سائے راستوں سے ہٹتے ہیں

اس چنار وادی میں کس بہار کے دن ہیں
تتلیاں کچلتے ہیں، کوک پر جھپٹتے ہیں

برف میں اکڑتے ہیں تن برہنہ باغوں کے
بیل کے سیاہ سپنے پیڑ سے لپٹتے ہیں

شام ہی سے عازمؔ کو کام میں لگا دیکھا
رتجگوں کے سرمائے خط میں آ سمٹتے ہیں

*

نہ جانے کیوں ہے یہ زندانِ جاں نشانہ مرا
جلا ہے تیر تمنا سے آشیانہ مرا

مرا یہ عذر ''میں یاں خود کو کھوجتا آیا''
خوش آیا خانہ برانداز کو بہانہ مرا

نوا نے بالِ ہوا پر مجھے بکھیر دیا
صبا کے جیبِ قبا میں اڑا ترانہ مرا

بہار بھر جو گلوں ہی کا زر سمیٹا ہے
خزاں کی زرد ہواؤں میں ہے خزانہ مرا

قرارِ قلبِ تپاں ناوکِ نظر سے ہے
مزارِ سینہ فگاراں ہے آستانہ مرا

فلک پہ پھیل نہ جائے یہ گھر کی بات مری
زمیں پہ درپئے آزار ہے زمانہ مرا

گلے کی پھانس بنی ہیں نمک نمک بوندیں
بھلے ہی لہجہ شکر خا ہے شاعرانہ مرا

رہِ طلب میں قدم کس حریم تک نہ گئے
کچھ آپ سے بھی تعارف ہے غائبانہ مرا

شبانہ شہر میں اترے کہاں کے فیل سوار
یہیں کہیں تو کبھی تھا غریب خانہ مرا

کچھ ان کے فتح کے اعلان میں رعونت تھی
کچھ اعتراف ہزیمت تھا جارحانہ مرا

قدم زمیں پہ جما کے اڑان بھرتا ہے
ہوا ہے آپ کے عازمؔ سے دوستانہ مرا

*

خلوتِ مہر و مہ کے پالے ہیں
شب کی شہ رگ میں جو اجالے ہیں

ہم نے تو پستیاں سنائی تھیں
تم نے دو شبد کیا اچھالے ہیں

شعر کے نیل کنٹھ ہو تو پیو
زہرِ جاں بخش کے پیالے ہیں

تاج پر حق جتانے والے یار
بھائی یوسف کے دیکھے بھالے ہیں

کھول تو دی ہیں کھڑکیاں اس نے
مسئلہ مکڑیوں کے جالے ہیں

بہکی بہکی سی یہ غزل عازمؔ
کیسی نالاں رتوں کے نالے ہیں

*

موسموں کا کیا کہنا عادتاً بدلتے ہیں
بے نیاز ہیں دریا چلتے ہیں تو چلتے ہیں

آپ کے تکلّف ہیں خلد کے نگارستاں
دل فروش دیوانے خود بخود بہلتے ہیں

اپنے آپ میں سورج، اپنی روشنی لے کر
میرے دیس کے جگنو ناز سے نکلتے ہیں

بے کنار پانی کی کروٹوں کے شہپارے
تر پلک کے دُردانے بحرِجاں میں پلتے ہیں

اک سفر کی منزل ہے اُس سے دو قدم آگے
جس مقام تک اگر پر کسی کے جلتے ہیں

دل جلوں کو راست آئی کس بلا کی آب و ہوا
قمقموں سے بجھتے ہیں آنسوؤں سے جلتے ہیں

پیاس کی کرامت سے شبنموں کے فوارے
ریت کے کلیجے سے ناگہاں ابلتے ہیں

تیر سے نوا روکیں، تیغ سے ہوا کاٹی
نے نواز کے در پے نیند میں اچھلتے ہیں

دیکھ دام میں عازمؔ آتے آتے بچ نکلا
موت! تیرے ہرکارے، حیف! ہاتھ ملتے ہیں

*

فریبِ دید رہا شرق و غرب میں غلطاں
حریمِ کعبہ کے اندر تلاشِ قبلہ کہاں

سرورِ جاں ہیں یہ تیری عنایتیں ساقی
کہ سنگِ رہ سے ٹپکنے لگا مئے عرفاں

یہ مصلحت کا مِلن تو نہیں، مگر ہم تم
ہے ایک تاکِ طراوت تو ایک تابستاں

حریفِ ذات ہوا ہے غبارِ آئینہ
حجابِ دید ہوئی میری آہِ غم ساماں

سبک تھی اوس کرن کا مذاق سہہ نہ سکی
کلی کے ہونٹ تپی دھوپ میں رہے خنداں

نہ رات ٹھیک سے سوئے، نہ دن کو جاگ سکے
سکوں کی راہ کے راہی رہے ہیں سرگرداں

جھلس نہ جائے رگِ تاک ہی میں روح سرور
سلگ رہا ہے غضب ناک زہد کا ایماں

مری سرشت میں اک نازِ سوماتی ہے
بڑا شریر، بڑا شوخ و شنگ ہے ناداں

میں ان کے ذوقِ غلامی سے دل فگار ہوا
گدا سمجھ کے مجھے چل دئے ترے غلماں

متاعِ جان و جگر میری شوخیوں پہ نہ جا
نشانِ عشق نہیں بس بکا و آہ و فغاں

کلی کا داغِ اہانت ترا پتا پوچھے
جواب ٹال کے نکلے گا تیرا ہیچمداں

سمیٹ شکوہ بچا اپنی آبرو عازمؔ
سخن شناس نہیں گوشِ گردشِ دوراں

*

یہ عذر خواہ نظر یوں نہ میری اور اٹھا
پلک کی نوک ادھیڑے گی زخم کا ٹانکا

میں انتظار میں کانٹوں سے ہمکنار رہا
قبا بچا کے چلی گل پرست بادِ صبا

وہ آفتاب جو ڈوبا جلا گیا مجھ کو
اور اب یہ چاند جو ابھرا بجھا کے جائے گا

جلے ہیں آج بھی جنگل میں دیودار کہیں
چنارِ جاں کی بجھی سانس میں دھواں دیکھا

جنونِ خام نے بوتل کے جن سے یاری کی
وہ ایک بار جو نکلا تو پھر سمٹ نہ سکا

شہیدِ شوق کی بھگدڑ میں لاش بھی نہ ملی
وہ حشر تھا کہ کوئی غم نصیب رو نہ سکا

اتر گیا ہے تو پھیلا ہوا سمندر ہے
گئی بہار کا عازمؔ چڑھا ہوا دریا

*

آسمانوں کا دل چُراتی ہے
گل زمیں سبز گیت گاتی ہے

صبح دم رشکِ کنجِ لب ہے افق
فرش کو عرش سے ملاتی ہے

خنجرِ شوخ ہے شعاعِ سحر
دل میں اتری، اترتی جاتی ہے

دیکھ شبنم ہے چشمِ نرگس میں
اس میں پہلی کرن نہاتی ہے

اک معما ہے روئے گل کی آگ
آنکھ کی پیاس کو بجھاتی ہے

ہے قبا تنگ اور کلی الھڑ — چھیڑ پ ُروا کی گل کھلاتی ہے
طفل خو ہے سبک روی میں صبا — فکرِ محزوں کو گدگداتی ہے
سایہ جب ساتھ چھوڑ دیتا ہے — اک نوا ہے جو کام آتی ہے
مست بھونرا ہے گنگناتا ہے — ہم کو عازمؔ کی یاد آتی ہے

*

جگر کی آگ جو یادِ وطن نے سلگائی — خیال چشمۂ شاہی سے پیاس بہلائی
ہوا کے ساتھ سِلا ہے نصیب کا دامن — خدا گواہ کہ خوشبو نہیں ہے ہر جائی
گلاب زینتِ گلداں، میں خاروخس، لیکن — ہیں دونوں قصرِ طرب میں شہید تنہائی
نہ پوچھ کس کے لیے ہیں یہ لفظ متروکات — نشاطِ سیر چمن، جھیل ڈل کی رعنائی
خدا کے خوف سے بیگانہ تھے خدا والے — خدا کے نام پہ بستی میں آگ بھڑکائی

[نشاط باغ ڈل جھیل کے کنارے پر، اور چشمہ شاہی کچھ اوپر پہاڑی پر واقع ہے]

*

اس کی حیرت میں کیا حکایت ہے — لوگ کیوں آئنے سے ڈرتے ہیں
عرش آماجگاہ کن کی ہے — اپنے آنگن پہ کون مرتے ہیں
یہ ہوا ہے حباب میں محبوس — یا سمندر بھی آہ بھرتے ہیں

*

ضبطِ حیا اور باغی زلفیں، موسم کا دم پھول گیا — وقتِ گریزاں دم بھر اپنی بھاگم بھاگ کو بھول گیا
آیا تھا، کچھ باتیں کرتا، اتنی بھی کچھ بات نہ تھی — لب سی کر بیٹھا بے بات کی بات کو دے کر طول گیا
جھڑکی کھائی، کچھ پچھتایا، کچھ تڑپا، کچھ شرمایا — آخر عازمؔ اس آنگن میں پھر حسبِ معمول گیا

*

ننھی سی جاں میں جرأتِ ابرِ بہار ہے
شبنم کی آبرو پہ سمندر نثار ہے

موسم کی اس ادا سے شجر کانپ رہے ہیں
پھل کی نمود شاخ کی شوخی پہ بار ہے

بزمِ طرب کے قہقہوں کی چھیڑ چھاڑ میں
اندر کی توڑ تاڑ ترا اشتہار ہے

رقبے میں ہے وسیع مرا شہر کا مکاں
اپنی فضا میں تنگ ہے، گھر ہے کہ غار ہے

دھرتی کو اس کا سر پھرا سایہ نچوڑ دے
یہ کس بلا کی بھوک ہوا پر سوار ہے

پی لے گی پیاس ریت کی، پانی کی آس کو
صحراؤں کے سفر پہ رواں رُودبار ہے

بادِ صبا شگفتِ گل و لالہ کی امیں
اس دور میں بھی شہر پناہوں کے پار ہے

*

اک تگ و تاز جاوداں ہوں میں
اک تلاطم کی داستاں ہوں میں

کس کو دوں، کیسے دوں پتا اپنا
اپنی آنکھوں پہ کیا عیاں ہوں میں

ماہ و انجم ہیں میرے سیّارے
اک ستارے کا آسماں ہوں میں

چاند پر جھاڑ کر زمیں کا غبار
پھر خلا کی طرف رواں ہوں میں

ہجر کی پیاس کا جلا صحرا
وصل کا گلشنِ جناں ہوں میں

پھول اگاتا ہوں قبر پر اپنی
اپنی میت کا قدر داں ہوں میں

جن کا تحفہ ہے یہ خزانِ جمیل
ان بہاروں کا مدح خواں ہوں میں

سرخ چھینٹے کہ پیرہن پر ہیں
موسمِ سبز کی فغاں ہوں میں

زرد آغوش میں ہیں سبز رتیں
شکر ہے سرخ رو خزاں ہوں میں

ہے شفا جن کی ضربِ کاری میں
ان گلوں کی بھری دکاں ہوں میں

کھل گیا تو فلک فلک روشن
گل کی آغوش میں نہاں ہوں میں

کہنہ الفاظ کی قبا پہنے
''خوش تر آں سر دلبراں'' ہوں میں

*

دور پردیس کو گیا دریا
کس کا تھا کس کا ہو گیا دریا

عمر ہا عمر کی مسافت میں
ایک لمحے کو رو گیا دریا

سو پہاڑوں کی نیند اڑا آیا
اک خرابے میں سو گیا دریا

دائرہ دائرہ ہے جبرِ حیات
بادل آئیں گے جو گیا دریا

اپنی موجوں کی ضربِ پیہم سے
اپنے سینے کو دھو گیا دریا

کوہ زادہ تھا، خود فروش نہ تھا
کس سمندر میں کھو گیا دریا

خود سر و خود شناس و خوش رفتار
مجھ کو عازمؔ ڈبو گیا دریا

*

بساطِ کون و مکاں، گوشۂ جگر آغوش
کشادہ خوب ہے، اور تنگ خوب تر، آغوش

بہل تو جائے کھلونوں سے بھی جنوں میرا
ہے یہ جہاں بھی، وہ فردوس بھی، مگر آغوش

ہے رقصِ بسمل جاں کو یہ کائنات آنگن
دلِ شکستہ کو ہے دامنِ نظر آغوش

ہمارا آپ کا تو رشتۂ تن و جاں ہے
فراق میں بھی ہے گویا کمال پر آغوش

مرا وجود دوامِ سفر سے ہے تعبیر
رہِ طلب میں خم و پیچِ رہگزر آغوش

بس آرزو ہے کہ ہو گل کو ایسی شام نصیب
کلی کو جیسی ہوئی تھی عطا سحر آغوش

ترا بھی قصہ بنے احسن القصص عازمؔ
ترے لئے بھی رہا چاہ بیشتر آغوش

*

ابر آزردہ ہے سوسن کی زباں سوکھی ہے
نہ ہوئی آج بھی بارش تو گزارا کیا ہے

سنگ الفاظ کی سازش سے زبان لال ہوئی
نازشِ بلبلِ نالاں کا اشارا کیا ہے

کھیل کا ہے نہ سلیقہ نہ تماشے کا دماغ
دلِ عاجز بھرے میداں میں ہمارا کیا ہے

رات کی تیرہ نصیبی میں درخشندہ رہا
راکھ کے ڈھیر میں یہ شوخ شرارا کیا ہے

سیرِ طفلانہ چہ و ضبطِ تمنّا زنداں
سفرِ یوسفِ جاں سارے کا سارا کیا ہے

چمنِ جاں کو ہے کیوں برقِ نظر کا ارماں
طلبِ سوختہ ساماں کا سہارا کیا ہے

تنگیٔ تن میں ہے کیا تارِ نفس کی ہستی
وسعتِ بحرِ تخیّل کا کنارا کیا ہے

پردۂ گردِ رہِ یار میں کیا ہے عازمؔ
سرد صدیوں کے سوالوں کا یہ دھارا کیا ہے

سکوت میں جو سنایا زبانِ سوسن نے
وہ باب ہم نے لکھا، حاصلِ کتاب رہا